© rasailojaraid.com

خلافت اور ملوکیت کا فرق

ابوالاعلیٰ مودودی

(۲)

قانون کی بالاتری کا خاتمہ سب سے بڑی مصیبت جو ملوکیت کے دور میں مسلمانوں پر آئی وہ یہ تھی کہ اس دور میں قانون کی بالاتری کا اصول توڑ دیا گیا، حالانکہ وہ اسلامی ریاست کے اہم ترین بنیادی اصولوں میں سے تھا۔

اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمراں، راعی اور رعیت، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص، سب اُس کے تابع ہیں۔ کوئی اُس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔ دوست ہو یا دشمن، حربی کافر ہو یا معاہد، مسلم رعیت ہو یا ذمی، مسلمان وفادار ہو یا باغی یا برسرِ جنگ غرض جو بھی ہو شریعت میں اُس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

خلافتِ راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی، حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدودِ شرع سے قدم باہر نہ رکھا۔ ان راست رو خلفاء کی حکومت کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ ایک حدود آشنا حکومت تھی نہ کہ مطلق العنان حکومت۔

مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد، اپنی سیاسی اغراض، اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقاء کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا۔ اگرچہ ان کے عہد میں بھی مملکت کا قانون اسلامی قانون ہی رہا۔ کتاب اللہ وسنّتِ رسول اللہ کی آئینی حیثیت کا اُن میں سے کسی نے کبھی انکار نہیں کیا۔ عدالتیں اسی قانون پر فیصلے کرتی تھیں، اور عام حالات میں سارے معاملات شرعی احکام ہی کے مطابق انجام دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں کی سیاست دین کی تابع نہ تھی۔ اُس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے، اور اس معاملہ میں حلال وحرام کی کوئی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔

حضرت معاویہ کے عہد میں | یہ پالیسی بھی حضرت معاویہ کے عہد ہی سے شروع ہو گئی تھی۔

امام زُہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنّت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا تھا، نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا۔ مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا[۲۴]۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دِیَت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے سنّت کو بدل دیا۔ سنّت یہ تھی کہ مُعاہد کی دِیَت مسلمان کے برابر ہوگی، مگر حضرت معاویہ نے اُس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی[۲۵]۔

ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود، اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں بر سرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے[۲۶]۔

---

[۲۴] البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۱۳۹ - ج ۹، ص ۲۳۲

[۲۵] ایضاً۔ ج ۸، ص ۱۳۹ - ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں: وکان معاویۃ اول من قصرھا الی النصف و اخذ النصف لنفسہ۔

[۲۶] الطبری، جلد ۴، ص ۱۸۸ - ابن الاثیر ج ۳، ص ۲۳۴ - ج ۴، ص ۱۵۴ - البدایہ، ج ۸، ص ۲۵۹، ج ۹، ص ۸۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آکر اپنے خاندان کی اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِّ علی کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (النحل: ۹۰)

مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اُس فوج میں تقسیم کیے جانے چاہییں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ لیکن حضرت معاویہ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لیے الگ نکال لیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔[۲۷]

زیاد بن سُمَیّہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے اُن افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لیے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سُمَیّہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہُوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہ کے والد جناب ابوسفیان نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیان نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد اُنہی کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبّر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہُوا۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں۔ اُن کے بعد حضرت معاویہ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لیے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد اُنہی کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اُسے

[۲۷] طبقات ابن سعد، ج ۷، ص ۲۸-۲۹۔ الطبری، ج ۴، ص ۱۸۷۔ الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۱۸۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۳۳۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا، کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ "بچہ اُس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو، اور زانی کے لیے کنکر پتھر ہیں۔" ام المومنین حضرت ام حَبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پردہ فرمایا۔[۲۸]

حضرت معاویہ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہ بن عَمرو بن غَیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جُرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دِیَت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا، مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔[۲۹] زیاد کو جب حضرت معاویہ نے بصرے کے ساتھ کوفہ کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لیے کوفے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اُس پر کنکر پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دیئے اور کنکر پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اسی وقت ان کے ہاتھ کٹوا دیئے۔[۳۰] کوئی مقدمہ اُن پر نہ چلایا گیا، کسی عدالت میں وہ نہ پیش کیے گئے۔ کوئی باقاعدہ قانونی شہادت ان کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لیے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ

۲۸؎ الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۹۶۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۲۰-۲۲۲۔ البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۲۸

۲۹؎ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۴۸۔ البدایہ، ج ۸، ص ۱۷

۳۰؎ الطبری، ج ۴، ص ۱۷۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افعال بُسر بن ابی اَرطاۃ نے کیے جسے حضرت معاویہ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؓ کے قبضے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لیے مامور کیا تھا۔ اس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباس کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اِن بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب اِن بچوں کو کس لیے قتل کر رہے ہو؟ بچے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابن اَرطاۃ، جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اُس سے بُری کوئی حکومت نہیں"[۳۱]۔ اِس کے بعد اِسی ظالم شخص کو حضرت معاویہ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جو اُس وقت حضرت علیؓ کے قبضے میں تھا۔ وہاں اُس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں، انہیں لونڈیاں بنا لیا[۳۲]، حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔

سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا، اِسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔ سب سے پہلا سر جو زمانۂ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسر کا سر تھا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مُسنَد میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سعد نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفّین میں حضرت عمار کا سر کاٹ کر حضرت معاویہ کے پاس لایا گیا اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے، ہر ایک کہتا تھا کہ عمار کو میں نے قتل کیا ہے (مسند احمد

---

[۳۱] الاستیعاب، ج ۱، ص ۶۵۔ الطبری، ج ۴، ص ۱۰۷۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۹۳۔ البدایہ ج ۸، ص ۹۰۔

[۳۲] الاستیعاب، ج ۱، ص ۶۵۔ ابنِ عبد البرؒ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی آپس کی جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتیں لونڈیاں بنائی گئیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث نمبر ۳۸، ۶۵۳ ، ۲۹ ۶۹۲۹- دار المعارف ، مصر ، ۱۹۵۲ - طبقات ابن سعد ، ج ۳ ، ص ۲۵۳۔

اس کے بعد دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایتِ عراق کے زمانہ میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے۔ وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مر گئے۔ تعاقب کرنے والے ان کی مُردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے۔ اس نے حضرت معاویہ کے پاس دمشق بھیج دیا۔ وہاں اسے برسرِ عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔[۳۳] ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابی بکر کے ساتھ کیا گیا جو وہاں حضرت علیؓ کے گورنر تھے۔ حضرت معاویہ کا جب مصر پر قبضہ ہوا تو انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلائی گئی۔[۳۴] اس کے بعد تو یہ ایک مستقل طریقہ ہی بن گیا کہ جن لوگوں کو سیاسی انتقام کی بنا پر قتل کیا جاتے اُن کے مرنے کے بعد ان کی لاشوں کو بھی معاف نہ کیا جاتے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق لے جایا گیا، اور میدانِ کربلا میں اُن کی لاش پر گھوڑے دوڑا کر اُسے روندا گیا۔[۳۵] حضرت نعمان بن بشیر، جو یزید کے زمانے تک بنی امیہ کے حامی رہے تھے، مروان کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن زبیر کا ساتھ دینے کی وجہ سے قتل کیے گئے اور ان کا سر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈالا گیا۔[۳۶] حضرت مصعب بن زبیر کا سر کوفہ اور مصر میں پھرایا گیا، پھر دمشق لے جا کر اسے منظرِ عام پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد شام کے شہروں میں اسے

۳۳؎ طبقات ابن سعد، ج ۶، ص ۲۵ - الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۴۰ - البدایہ، ج ۸، ص ۴۸

۳۴؎ الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۳۵ - الطبری ج ۴، ص ۷۹ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۸۰۔

۳۵؎ الطبری، ج ۴، ص ۳۴۹ - ۳۵۰ - ۳۵۱ - ۳۵۶ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۹۶ تا ۲۹۸ - البدایہ، ج ۸، ص ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۱ - ۱۹۲ -

۳۶؎ طبقات ابن سعد، ج ۶، ص ۵۳ - البدایہ، ج ۸، ص ۲۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھرانے کا ارادہ تھا، مگر خود عبدالملک بن مروان کی بیوی، عاتکہ بنت یزید بن معاویہ نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا، جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے کیا اس سے بھی تمہارا دل ٹھنڈا نہ ہوا؟ اب اس کی نمائش کیوں کرتے پھر رہے ہو؟ پھر اس سر کو اتروا کر غسل دلوایا اور دفن کرادیا[۲۷]۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء عبداللہ بن صفوان اور عمارہ بن حزم کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سخت وحشت و جاہلیت برتی گئی۔ ان کے سر کاٹ کر مکہ سے مدینہ، اور مدینہ سے دمشق لے جائے گئے، جگہ جگہ ان کی نمائش کی گئی، اور مکہ میں ان کی لاشیں کئی روز تک سولی پر لٹکتی رہیں یہاں تک کہ وہ سڑ گئیں[۲۸]۔ قطع نظر اس سے کہ جن لوگوں کے مرنے کے بعد یہ سلوک ان کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا وہ کس پائے کے لوگ تھے، سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کرنا جائز رکھا ہے؟

یزید کے دور میں حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لیے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے کی جو ابتدا ہوئی تھی، اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔ اس کے زمانہ میں تین ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے پوری دنیائے اسلام کو لرزہ براندام کر دیا۔

پہلا واقعہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ہے۔ بلاشبہ وہ اہل عراق کی دعوت پر یزید کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور یزید کی حکومت انہیں برسرِ بغاوت سمجھتی تھی۔ ہم اس سوال سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کیے لیتے ہیں کہ اصولِ اسلام کے لحاظ سے حضرت حسینؓ کا یہ خروج جائز تھا یا نہیں۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد صحابہ و تابعین میں سے کسی ایک شخص کا بھی یہ قول ہمیں نہیں ملتا کہ ان کا خروج ناجائز تھا اور وہ ایک فعلِ حرام کا ارتکاب کرنے جا رہے تھے۔ صحابہ میں سے جس نے بھی ان کو نکلنے سے روکا تھا وہ اس بنا پر تھا

---

[۲۷] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۴۔

[۲۸] الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۵۳-۳۵۴۔ الطبری، ج ۵، ص ۳۳-۳۴۔ البدایہ، ج ۸، ص ۳۳۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ تدبیر کے لحاظ سے یہ اقدام نامناسب ہے۔ تاہم اس معاملہ میں یزید کی حکومت کا نقطۂ نظر ہی صحیح مان لیا جائے تب بھی یہ تو امرِ واقعہ ہے کہ وہ کوئی فوج لے کر نہیں جا رہے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ اُن کے بال بچے تھے، اور صرف ۳۲ سوار اور ۴۰ پیادے۔ اِسے کوئی شخص بھی فوجی چڑھائی نہیں کہہ سکتا۔ اُن کے مقابلہ میں عمر بن سعد بن ابی وقاص کے تحت جو فوج کوفہ سے بھیجی گئی تھی اس کی تعداد ۴ ہزار تھی۔ کوئی ضرورت نہ تھی کہ اتنی بڑی فوج اِس چھوٹی سی جمعیت سے جنگ ہی کرتی اور اسے قتل کر ڈالتی۔ وہ اسے محصور کر کے بآسانی گرفتار کر سکتی تھی۔ پھر حضرت حسین نے آخر وقت میں جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا کہ یا تو مجھے واپس جانے دو، یا کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو، یا مجھ کو یزید کے پاس لے چلو۔ لیکن ان میں سے کوئی بات نہ مانی گئی اور اصرار کیا گیا کہ آپ کو عبید اللہ بن زیاد (کوفہ کے گورنر) ہی کے پاس چلنا ہوگا۔ حضرت حسین اپنے آپ کو ابنِ زیاد کے حوالہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ مسلم بن عَقیل کے ساتھ جو کچھ وہ کر چکا تھا وہ انہیں معلوم تھا۔ آخر کار اُن سے جنگ کی گئی۔ جب اُن کے سارے ساتھی شہید ہو چکے تھے اور وہ میدانِ جنگ میں تنہا رہ گئے تھے، اُس وقت بھی اُن پر حملہ کرنا ہی ضروری سمجھا گیا، اور جب وہ زخمی ہو کر گر پڑے تھے اُس وقت اُن کو ذبح کیا گیا۔ پھر اُن کے جسم پر جو کچھ تھا وہ لوٹا گیا حتیٰ کہ ان کی لاش پر سے کپڑے تک اتار لیے گئے اور اس پر گھوڑے دوڑا کر اسے روندا گیا۔ اس کے بعد ان کی قیام گاہ کو لوٹا گیا اور خواتین کے جسم پر سے چادریں تک اتار لی گئیں۔ اس کے بعد اُن سمیت تمام شہدائے کربلا کے سر کاٹ کر کوفہ لے جائے گئے۔ اور ابنِ زیاد نے نہ صرف برسرِ عام ان کی نمائش کی بلکہ جامع مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ الحمد للہ الذی اظہر الحق واھلہ ونصر امیر المومنین یزید وحزبہ وقتل الکذاب ابن الکذاب الحسین بن علی وشیعتہ۔ پھر یہ سارے سر یزید کے پاس دمشق بھیجے گئے، اور اس نے بھرے دربار میں ان کی نمائش کی۔[۳۹] فرض کیجیے کہ حضرت حسین یزید کے نقطۂ نظر کے

[۳۹] اس پوری داستان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الطبری، ج ۴، ص ۳۰۹ تا ۳۵۶۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۸۲ تا ۲۹۹۔ اور البدایہ، ج ۸، ص ۱۷۰ تا ۲۰۴۔ اس کے علاوہ میرا رسالہ "شہادتِ حسینؓ" بھی ملاحظہ ہو جس میں حضرت حسینؓ کے خروج کے متعلق میں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق بر سرِ بغاوت ہی تھے، تب بھی کیا اسلام میں حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں کے لیے کوئی قانون نہ تھا؟ فقہ کی تمام مبسوط کتابوں میں یہ قانون لکھا ہوا موجود ہے۔ مثال کے طور پر صرف ہدایہ اور اس کی شرح فتح القدیر، باب البغاۃ میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس قانون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ساری کارروائی جو میدانِ کربلا سے لیکر کوفے اور دمشق کے دربار تک کی گئی اس کا ایک ایک جُز قطعاً حرام اور سخت ظلم تھا۔ دمشق کے دربار میں جو کچھ یزید نے کیا اور کہا اس کے متعلق روایات مختلف ہیں، لیکن اگر سب روایتوں کو چھوڑ کر یہی روایت صحیح مان لی جائے کہ وہ حضرت حسین اور ان کے ساتھیوں کے سر دیکھ کر آبدیدہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ "میں حسین کے قتل کے بغیر بھی تم لوگوں کی طاعت سے راضی تھا، اللہ کی لعنت ہو ابنِ زیاد پر، خدا کی قسم اگر میں وہاں ہوتا تو حسین کو معاف کردیتا" اور یہ کہ "خدا کی قسم اے حسین، میں تمہارے مقابلے میں ہوتا تو تمہیں قتل نہ کرتا"[۳۳] تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس ظلمِ عظیم پر اُس نے اپنے سر پھرے گورنر کو کیا سزا دی؟ حافظ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی، نہ اسے معزول کیا، نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا۔[۳۴] اسلام تو خیر بدرجہا بلند چیز ہے، یزید میں اگر انسانی شرافت کی بھی کوئی رمق ہوتی تو وہ سوچتا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے پُورے خاندان پر کیا احسان کیا تھا، اور اُس کی حکومت نے اُن کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کیا!

اس کے بعد دوسرا سخت المناک واقعہ جنگ حرہ کا تھا جو ۶۳ھ کے آخر اور خود یزید کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا۔ اِس واقعہ کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ اہلِ مدینہ نے یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم قرار دے کر اُس کے خلاف بغاوت کر دی، اس کے عامل کو شہر سے نکال دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کو اپنا سربراہ بنا لیا۔ یزید کو یہ اطلاع پہنچی تو اس نے مسلم بن عُقبۃ المُرّی کو (جسے سلف صالحین مُسرِف بن عُقبہ کہتے ہیں) ۱۲ ہزار فوج دے کر مدینہ پر چڑھائی کے لیے بھیج دیا، اور اسے حکم دیا کہ تین دن تک

---

۳۳ الطبری، ج ۴، ص ۳۵۲ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۹۸ - ۲۹۹

۳۴ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۰۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہلِ شہر کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے رہنا۔ پھر اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرنا، اور جب فتح پالو تو تین دن کے لیے مدینہ کو فوج پر مباح کر دینا۔ اس ہدایت پر یہ فوج گئی۔ جنگ ہوئی۔ مدینہ فتح ہوا۔ اور اس کے بعد یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لیے فوج کو اجازت دے دی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے۔ ان تین دنوں میں شہر کے اندر ہر طرف لوٹ مار کی گئی، شہر کے باشندوں کا قتلِ عام کیا گیا جس میں، امام زُہری کی روایت کے مطابق، سات سو مُعززین اور دس ہزار کے قریب عوام مارے گئے، اور غضب یہ ہے کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھُس گھُس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ حتی قیل انہ حبلت الف امرأۃ فی تلک الایام من غیر زوج (کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں)[۲۴]۔ بالفرض اہلِ مدینہ کی بغاوت ناجائز ہی تھی، مگر کیا کسی باغی مسلمان آبادی، بلکہ غیر مسلم باغیوں اور حربی کافروں کے ساتھ بھی اسلامی قانون کی رُو سے یہ سلوک جائز تھا؟ اور یہاں تو معاملہ کسی اور شہر کا نہیں، خاص مدینۃ الرسول کا تھا جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے یہ ارشادات بخاری، مسلم، نسائی اور مُسند احمد میں متعدد صحابہ سے منقول ہوئے ہیں کہ لا یرید احد المدینۃ بسوءٍ الا اذابہ اللہ فی النار ذوب الرّصاص (مدینہ کے ساتھ جو شخص بھی بُرائی کا ارادہ کرے گا اللہ اسے جہنّم کی آگ میں سیسے کی طرح پگھلا دے گا) اور من اخاف اھل المدینۃ ظلمًا اخافہ اللہ وعلیہ لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین لا یقبل اللہ منہ یوم القیٰمۃ صرفًا ولا عدلًا (جو شخص اہلِ مدینہ کو ظلم سے خوف زدہ کرے اللہ اسے خوف زدہ کرے گا۔ اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے روز اللہ اس سے کوئی چیز اس گناہ کے فدیے میں قبول نہ فرمائے گا)۔ حافظ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ انہی احادیث کی بنیاد پر علماء کے ایک گروہ نے یزید پر لعنت کو جائز رکھا ہے، اور ایک قول ان کی تائید میں امام احمد بن حنبل کا بھی ہے، مگر ایک دوسرا گروہ صرف اس لیے اس سے منع کرتا ہے کہ کہیں اس طرح اُس کے

---

[۲۴] اس واقعہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الطبری، ج ۴، ص ۳۷۲ تا ۳۷۹ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۱۰ تا ۳۱۳ - البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۲۱۹ تا ۲۲۱ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والد یا صحابہ میں سے کسی اور پر لعنت کرنے کا دروازہ نہ کھل جائے[۴۲]۔ حضرت حسن بصری کو ایک مرتبہ یہ طعنہ دیا گیا کہ آپ جو بنی اُمیّہ کے خلاف خروج کی کسی تحریک میں شامل نہیں ہوتے تو کیا آپ اہلِ شام (یعنی بنی اُمیّہ) سے راضی ہیں؟ جواب میں انہوں نے فرمایا "میں اور اہلِ شام سے راضی ہوں؟ خدا اُن کا ناس کرے، کیا وہی نہیں ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم کو حلال کر لیا اور تین دن تک اُس کے باشندوں کا قتلِ عام کرتے پھرے، اپنے نَبَطی اور قبطی سپاہیوں کو اس میں سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ دے دی اور وہ شریف دیندار خواتین پر حملے کرتے رہے اور کسی حرمت کی ہتک

[۴۳] البدایہ، ج ۸، ص ۲۲۳۔ امام احمد بن حنبل کے جس قول کا حوالہ ابن کثیر نے دیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ نے اُن سے پوچھا: یزید پر لعنت کرنے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "میں کیسے اُس شخص پر لعنت نہ کروں جس پر خدا نے لعنت کی ہے"۔ اور اس کے ثبوت میں انہوں نے یہ آیت پڑھی:
فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ (محمد، آیت ۲۲-۲۳) "پھر تم سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم فرمانروا ہو گئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور قطع رحمی کرو گے؟ ایسے ہی لوگ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے"۔ یہ آیت پڑھ کر امام نے فرمایا اُس سے بڑا فساد اور اُس سے بڑی قطع رحمی اور کیا ہوگی جس کا ارتکاب یزید نے کیا۔ امام احمدؒ کے اِس قول کو محمد بن عبدالرسول البرزنجی نے الاشاعہ فی اشراط الساعہ میں اور ابن حجر الہیتمی نے الصواعق المحرقہ میں نقل کیا ہے۔ مگر علامہ سفارینی اور امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ زیادہ معتبر روایات کی رُو سے امام احمد یزید پر لعنت کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علمائے اہل السنہ میں سے جو لوگ جوازِ لعنت کے قائل ہیں ان میں ابن جوزی، قاضی ابو یعلیٰ، علامہ تفتازانی اور علامہ جلال الدین سیوطی نمایاں ہیں۔ اور عدمِ جواز کے قائلین میں نمایاں ترین بزرگ امام غزالی اور امام ابن تیمیہ ہیں۔ میرا اپنا میلان اِس طرف ہے کہ صفاتِ ملعونہ کے حاملین پر جامع طریقہ سے تو لعنت کی جا سکتی ہے (مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظالموں پر خدا کی لعنت)، مگر کسی شخصِ خاص پر متعین طریقہ سے لعنت کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ زندہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بعد میں توبہ کی توفیق عطا فرما دے، اور اگر مر چکا ہو تو ہم نہیں جانتے کہ اس کا خاتمہ کس چیز پر ہوا ہے۔ اس لیے ہمیں ایسے لوگوں کے غلط کاموں کو غلط کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے اور لعنت سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے سے نہ رُکے۔ پھر بیت اللہ پر چڑھ دوڑے، اس پر سنگ باری کی اور اس کو آگ لگائی۔ اُن پر خدا کی لعنت ہو اور وہ بُرا انجام دیکھیں۔[۴۴]

تیسرا واقعہ وہی ہے جس کا حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں ذکر کیا ہے۔ مدینہ سے فارغ ہونے کے بعد وہی فوج جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں یہ اودھم مچایا تھا، حضرت زبیرؓ سے لڑنے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوئی اور اس نے مَنجَنیقیں لگا کر خانہ کعبہ پر سنگباری کی جس سے کعبہ کی ایک دیوار شکستہ ہو گئی۔ اگرچہ روایات یہ بھی ہیں کہ انہوں نے کعبہ پر آگ بھی برسائی تھی۔ لیکن آگ لگنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ البتہ سنگ باری کا واقعہ متفق علیہ ہے۔[۴۵]

ان واقعات نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ یہ حکمراں اپنے اقتدار اور اس کے بقاء و تحفظ کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اور اس کے لیے انہیں کسی حد کو پھاند جانے اور بڑی سے بڑی حرمت کو توڑ ڈالنے میں بھی باک نہ تھا۔

دولتِ بنی مروان میں | اس کے بعد مروان اور اس کی اولاد کا دورِ حکومت آیا اور اس میں دین سے سیاست کی آزادی، بلکہ سیاست پر دین کے احکام و حدود کی قربانی انتہا کو پہنچ گئی۔ عبدالملک بن مروان اگرچہ بڑے درجے کے فقہاء میں سے تھا، بادشاہت سے پہلے اسے مدینہ میں حضرت سعید بن المسیّب، عُروہ بن زبیر، اور قَبیصہ بن ذُؤیب کے مرتبے کا فقیہ سمجھا جاتا تھا، اور یزید کے زمانہ میں اس نے کعبہ پر سنگ باری کے خلاف سخت ناراضی کا اظہار کیا تھا، مگر جب وہ خود خلیفہ ہوا تو اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف جنگ کے لیے حجاج بن یوسف کو مکہ بھیج دیا۔ اس ظالم نے عین حج کے زمانہ میں مکۂ معظمہ پر چڑھائی کی جبکہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین بھی جنگ سے ہاتھ روک لیتے تھے۔ کوہ ابوقُبَیس پر منجنیقیں لگا کر خانۂ کعبہ پر سنگ باری کی

۴۴ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۷۰

۴۵ الطبری، ج ۴، ص ۳۸۳ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۱۶ - البدایہ، ج ۸، ص ۲۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عبداللہ بن عمر کے سخت اصرار پر یہ سنگ باری صرف اتنی دیر کے لیے روکی گئی کہ باہر سے آئے ہوئے حجاج طواف وسعی کرلیں۔ لیکن نہ اُس سال کے حج میں مکہ کے لوگ منیٰ اور عرفات جاسکے، اور نہ خود حجاج کی فوج کے لوگ طواف وسعی کرسکے۔ باہر سے آنے والوں نے جب طوافِ زیارت کرلیا تو حجاج نے اعلان کیا کہ سب حاجی نکل جائیں اور ازسرِنو سنگ باری شروع کردی[۷۶]۔ پھر فتح کے بعد جو کچھ عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن صفوان اور عمارہ بن حزم کے سروں اور ان کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا اس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں۔

عبدالملک اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے کی سب سے بڑی لعنت حجاج کی گورنری تھی جسے ۲۰ سال تک ظلم وستم کی کھلی چھوٹ ملی رہی۔ اگرچہ کوئی انسان بھی دنیا میں مجسم شر نہیں ہوتا اور حجاج بن یوسف بھی خیر سے بالکل خالی نہ تھا۔ قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔ سندھ کی فتح بھی اسی کے کارناموں میں سے ہے جس کی بدولت آج اِس سرزمین میں اللہ کا نام لینے والے پائے جاتے ہیں۔ مگر کسی شخص کی ساری نیکیاں بھی ایک مومن کے قتلِ ناحق کی ہم وزن نہیں ہوسکتیں، کجا کہ وہ ظلم وستم جس کا ارتکاب اس نے اپنے طویل دورِ حکومت میں کیا۔ مشہور امام قراءت عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ "اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی جس کا ارتکاب اِس شخص نے نہ کیا ہو"۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاج کو پیش کرکے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں"۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کو وہ سردارِ منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "اگر ابن مسعود مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا"۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ "ابن مسعودؓ کی قراءت پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو میں اس کی گردن مار دوں گا اور مصحف میں سے اُس قراءت کو اگر سؤر کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دونگا"۔ اس نے حضرت انس بن مالک اور حضرت سہل بن سعد ساعدی جیسے بزرگوں کو گالیاں دیں اور ان کی گردنوں پر مہریں لگائیں

---

[۷۶] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۲۳۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۳۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس نے حضرت عبداللہ بن عمر کو قتل کی دھمکی دی۔ وہ علانیہ کہتا تھا کہ اگر میں لوگوں کو مسجد کے ایک دروازے سے نکلنے کا حکم دوں اور وہ دوسرے دروازے سے نکلیں تو میرے لیے اُن کا خون حلال ہے۔ اس کے زمانہ میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار بتائی جاتی ہے۔ جب وہ مرا ہے تو اس کے قید خانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑ رہے تھے[۴۷] اور یہ ظالم گورنر تھا جس کے حق میں عبدالملک نے اپنی اولاد کو مرتے وقت وصیت کی کہ "حجاج بن یوسف کا ہمیشہ لحاظ کرتے رہنا، کیونکہ وہی ہے جس نے ہمارے لیے سلطنت ہموار کی، دشمنوں کو مغلوب کیا، اور ہمارے خلاف اٹھنے والوں کو دبا دیا[۴۸]"

یہ وصیت اُس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت ان کے اپنے اقتدار کی تھی۔ اُس کا قیام و استحکام جس ذریعہ سے بھی ہو، ان کے نزدیک مستحسن تھا، قطع نظر اس سے کہ شریعت کی تمام حدیں اس کی خاطر توڑ ڈالی جائیں۔

یہ ظلم و ستم اِس حد کو پہنچ گیا تھا کہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز چیخ اُٹھے کہ "عراق میں حجاج، شام میں ولید، مصر میں قُرّہ بن شریک، مدینہ میں عثمان بن حیّان، مکہ میں خالد بن عبداللہ القسری، خداوندا تیری دنیا ظلم سے بھر گئی ہے، اب لوگوں کو راحت دے[۴۹]"۔ سیاسی ظلم کے علاوہ یہ لوگ عام دینی معاملات میں بھی بڑی حد تک انحراف پسند ہو گئے تھے۔ نمازوں میں غیر معمولی تاخیر ان کا معمول تھا[۵۰]۔ جمعہ کا پہلا خطبہ بیٹھ کر دیتے تھے[۵۱]۔ عیدین میں نماز سے پہلے خطبہ دینے کا طریقہ مروان

[۴۷] اِن تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الاستیعاب ج ۱، ص ۳۵۔ ج ۲، ص ۱۵۷۔ ابن الاثیر ج ۴، ص ۲۹۔ ۱۴۳۔ البدایہ، ج ۹، ص ۲-۸۳-۹۱-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۱ تا ۱۳۸

[۴۸] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۰۳۔ البدایہ ج ۹، ص ۶۷

[۴۹] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۳۲

[۵۰] البدایہ، ج ۹، ص ۸۹۔

[۵۱] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۱۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اختیار کیا اور اس کے خاندان کے لیے یہ مستقل سنت بن گیا۔[۵۲]

عمر بن عبد العزیز بنی امیہ کی حکومت کے پورے ۹۲ سالہ دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کے ڈھائی سال تاریکی میں روشنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا رُخ جس واقعہ نے بدلا وہ یہ تھا کہ ۹۳ھ میں، جبکہ وہ مدینہ کے گورنر تھے، ولید بن عبد الملک کے حکم سے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے صاحبزادے خُبَیب کو ۵۰ کوڑے لگوائے گئے، پھر سردی کے موسم میں اُن کے سر پر ٹھنڈے پانی کی مشک چھوڑ دی گئی، پھر اُن کو دن بھر مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑا رکھا گیا، آخر کار اسی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔[۵۳] یہ ایک صریح ظلم تھا اور ایک قطعاً غیر شرعی سزا تھی جس کا ارتکاب گورنر کی حیثیت میں عمر بن عبد العزیز کو کرنا پڑا، مگر اس کے بعد انہوں نے گورنری سے استعفا دیدیا اور ان پر سخت رنج اور خوفِ خدا مسلط ہو گیا۔

۹۹ھ میں جب سلیمان بن عبد الملک کی خفیہ وصیت کی بنا پر وہ خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے خلافت اور بادشاہی کا فرق نمایاں کر کے رکھ دیا۔ بیعت کی پہلی تقریر جو انہوں نے کی اس کے الفاظ یہ ہیں:

> "میں اِس حکومت کی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں بغیر اس کے کہ میں نے اسے طلب کیا ہوتا، یا مجھ سے اس معاملہ میں رائے لی گئی ہوتی، یا مسلمانوں سے مشورہ لیا گیا ہوتا۔ تمہاری گردنوں میں میری بیعت کا جو قلادہ ہے اسے میں اتارے دیتا ہوں۔ اب تم لوگ خود جسے چاہو اپنے معاملات کا سربراہ بنالو۔"

مجمع نے بیک آواز کہا کہ ہم آپ ہی کو پسند کرتے ہیں، آپ کی حکومت پر ہم سب راضی ہیں۔ تب انہوں نے خلافت قبول کی اور فرمایا:

> "درحقیقت اس امت میں کوئی اختلاف اپنے رب اور اپنے نبی اور اپنے

[۵۲] الطبری، ج ۶، ص ۲۶۔ البدایہ، ج ۸، ص ۲۵۸۔ ج ۱۰، ص ۳۰۔۳۱۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۰۰

[۵۳] البدایہ، ج ۹، ص ۸۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دین کی کتاب کے بارے میں نہیں ہے بلکہ دینار و درہم کے معاملہ میں ہے۔ خدا کی قسم، میں کسی کو نہ باطل طریقے سے دونگا، نہ کسی کا جائز حق روکوں گا۔ لوگو، جو اللہ کی اطاعت کرے اس کی اطاعت واجب ہے، اور جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔ جب تک میں اللہ کا مطیع رہوں، میری اطاعت کرو، اور جب میں اللہ کا نافرمان ہو جاؤں تو میری اطاعت ہرگز تم پر لازم نہیں ہے[۵۴]۔"

اس کے بعد انہوں نے یک لخت وہ تمام شاہانہ طور طریقے ختم کر دیئے جو اُن کے آباؤ اجداد نے اختیار کر رکھے تھے اور وہ طرزِ زندگی اختیار کیا جو خلفائے راشدین کے طرز سے مشابہ تھا۔ پھر وہ تمام جائدادیں واپس کیں جو خود اُن کو ناجائز طریقہ سے وراثت میں ملی تھیں، حتیٰ کہ اپنی بیوی کے زیورات اور جواہر وغیرہ بھی بیت المال میں داخل کر دیئے، اور ۴۰ ہزار دینار سالانہ کی جائداد میں سے صرف ۴ سو دینار سالانہ کی جائداد اپنے پاس رہنے دی جو جائز طور پر ان کی ملکیت تھی[۵۵]۔ اِس طرح سب سے پہلے خود اپنا حساب خدا اور اُمت سے صاف کرنے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ شاہی خاندان اور اس کے امراء میں سے جس کے خلاف بھی کسی کا دعویٰ ہو وہ اپنی شکایت پیش کرے، اور جس جس نے بھی ثابت کر دیا کہ کوئی چیز اُس سے غصب کی گئی تھی اُس کا حق اُسے واپس دلوایا۔ اس پر بنی اُمیّہ کے گھروں میں کہرام مچ گیا اور انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو، جس کا وہ بہت ادب لحاظ کرتے تھے، اُن کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں اِس کام سے روکے۔ مگر انہوں نے اس کو جواب دیا کہ "جب فرمانروا کے اپنے عزیز قریب ظلم کریں اور فرمانروا اس کا ازالہ نہ کرے تو وہ دوسروں کو کیا منہ لے کر ظلم سے روک سکتا ہے۔" اُس نے کہا "تمہارے خاندان کے لوگ تمہیں متنبہ کرتے ہیں کہ اس روش کا تمہیں سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" انہوں نے جواب دیا "قیامت کے خوف سے بڑھ کر اگر مجھے کسی چیز کا خوف ہو تو میں دُعا کرتا ہوں کہ مجھے

[۵۴] البدایہ، ج ۹، ص ۲۱۲-۲۱۳

[۵۵] البدایہ، ج ۹، ص ۲۰۰-۲۰۸- ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۵۳-۱۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس چیز سے امن نصیب نہ ہو۔" آخر کار وہ مایوس ہو کر پلٹی اور اس نے اپنے کنبے کے لوگوں سے کہا: "یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم عمرؓ بن خطاب کے خاندان کی لڑکی بیاہ لاتے، آخر کار لڑکا اپنے نانا پر چلا گیا[56]" (واضح رہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی والدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں)۔

اُن کے احساس ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ اپنے پیش رو سلیمان بن عبدالملک کو دفن کر کے جب پلٹے تو بڑے غمگین دکھائی دے رہے تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ بادشاہی ملنے پر خوش ہونے کے بجائے اُلٹے رنجیدہ ہیں۔ پوچھا گیا کہ اس رنج و غم کا سبب کیا ہے۔ فرمایا "مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اس امتِ محمد کا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کا حق اُس کی طلب کے بغیر مجھے ادا کرنا نہ ہو[57]۔"

ان کی بیوی کا بیان ہے کہ میں ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ جانماز پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو کیا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا "میں نے امتِ محمدؐ کے معاملات اپنے سر لیے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ کوئی بھوکا فقیر ہے۔ کوئی بے کس مریض ہے۔ کوئی مظلوم مقہور ہے۔ کوئی غریب قیدی ہے۔ کوئی بوڑھا ضعیف ہے۔ کوئی عیالدار مفلس ہے۔ غرض ملک کے ہر گوشے میں اس طرح کے لوگ پھیلے ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا رب قیامت کے روز مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے ان کے لیے کیا کیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے مقابلے میں مستغیث ہوں گے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں مقدمہ میرے خلاف نہ ثابت ہو جائے۔ اس لیے اپنے آپ پر ترس کھا کر رو رہا ہوں[58]۔"

انہوں نے ظالم گورنروں اور عاملوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اچھے حاکم مقرر کیے۔ وہ تمام ناجائز ٹیکس موقوف کیے جو بنی امیہ کے عہد میں وصول کیے جانے لگے تھے۔ مسلمان ہو جانے والوں پر جزیہ لگانے کا طریقہ بند کر دیا۔ اور اپنے حکام کو سخت تاکیدی احکام بھیجے کہ کسی مسلمان یا ذمی کو قانون کے خلاف کوڑے نہ لگاتے جائیں، اور کسی کو قتل یا ہاتھ کاٹنے کی سزا مجھ سے پوچھے بغیر

۵۶ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۶۴۔ البدایہ، ج ۹، ص ۲۱۴

۵۷ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۶۴

۵۸ ایضاً، ج ۴، ص ۱۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ دی جائے۔[59]

ان کے آخر عہد میں خارجیوں کے ایک گروہ نے ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ انہوں نے اس گروہ کے سردار کو لکھا کہ خون خرابے سے کیا حاصل ہے، آکر مجھ سے بحث کر لو، تم حق پر ہو گے تو میں مان لونگا، میں حق پر ہوا تو تم مان لینا۔ خارجی سردار نے یہ بات تسلیم کر لی اور دو آدمی بحث کے لیے بھیج دیئے۔ اُن دونوں نے کہا "ہم مانتے ہیں کہ آپ کا طریقہ آپ کے اہلِ خاندان سے مختلف ہے اور اُن کے اعمال کو آپ مظالم سے تعبیر کرتے ہیں، مگر یہ کیا بات ہے کہ جب وہ ضلالت پر تھے تو آپ ان پر لعنت نہیں کرتے؟" حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا "کیا ان کی مذمت کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ میں ان کے اعمال کو مظالم کہتا ہوں؟ اس کے بعد آخر لعنت کرنا ہی کیوں ضروری ہے؟ تم نے فرعون پر کتنی مرتبہ لعنت کی ہے؟" اس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز خارجیوں کی ایک ایک بات کا مُسکت جواب دیتے چلے گئے۔ آخر اُن میں سے ایک نے کہا "کیا ایک عادل آدمی یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا جانشین ایک ظالم ہو؟" انہوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا "کیا آپ اپنے بعد یزید بن عبدالملک کے حوالے یہ خلافت کر جائیں گے درانحالیکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ حق پر قائم نہ رہے گا؟" انہوں نے کہا کہ "اُس کے لیے تو میرا پیش رو (سلیمان بن عبدالملک) پہلے ہی میرے بعد ولی عہدی کی بیعت لے چکا ہے، اب میں کیا کر سکتا ہوں" اس نے کہا "کیا آپ کے خیال میں وہ شخص جس نے آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو نامزد کیا ہے اُسے ایسا کرنے کا حق تھا اور اس کا یہ فیصلہ برحق ہے؟" اس پر عمر بن عبدالعزیز لاجواب ہو گئے اور مجلس برخاست ہونے کے بعد بار بار کہتے رہے کہ "یزید کے معاملہ نے مجھے مار ڈالا، اس حجت کا میرے پاس کوئی جواب نہیں، خدا مجھے معاف کرے۔"[60]

یہی وہ واقعہ ہے جس کے بعد بنی امیّہ کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب یہ خاندانی بادشاہت بھی ختم کر کے چھوڑیں گے اور خلافت کو شوریٰ کے حوالہ کر جائیں گے۔ اس کے تھوڑی مدت بعد ہی انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا، اور پھر وہی سب کچھ ہونے لگا جو پہلے سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ (باقی)

---

۵۹ الطبری، ج ۵، ص ۳۱۴ و ۳۱۵ و ۳۲۱ - ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۵۸ - ۱۶۳

۶۰ الطبری، ج ۵، ص ۳۱۱ - ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۵۵ - ۱۵۷ -

© rasailojaraid.com